A registered Political Party
ECI Registration No. 56/89/2011/PPS-I

میں ہی بھارت کا منشور

ڈاکٹر سبودھ چندر رائے
M.Sc., Ph.D., LL.B.
قومی صدر

بھارت، یعنی انڈیا، خود کو ایک آزاد، خود مختار، جمہوری قوم قرار دیتا ہے۔ جمہوریت کا ایک بنیادی اصول اکثریت کی مرضی کے مطابق حکمرانی کا تقاضا کرتا ہے، اور ان کی خواہشات کی تکمیل کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اگر ہم بھارت کو ایک فعال جمہوریت تسلیم کرتے ہیں، تو یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے اسے اکثریت کی مرضی کا براہ راست مظہر سمجھا جانا چاہیے۔ لہٰذا، لاکھوں افراد کو لاحق وسیع پیمانے پر بھوک، ناخواندگی، بے روزگاری، اور بیماری، ریاست کے قانونی اختیار میں لپٹے من مانے اور غیر قانونی اقدامات، اور معاشرے کے ہر سطح پر پھیلی ہوئی بدعنوانی— یہ سب ہماری مکمل، بے چون و چرا خاموشی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیونکہ، اگر جمہوریت کے اس ڈھونگ میں کوئی سچائی ہے، تو ان میں سے کوئی

بھی خوفناک حقیقت ہماری واضح، اجتماعی رضامندی کے بغیر موجود نہیں ہو سکتی۔

جس طرح ایک باپ اپنے خاندان کی پرورش کرتا ہے، اسی طرح کسان پورے ملک کی پرورش کرتے ہیں۔ منطقی طور پر یہ اجتماعی کسان برادری کو بجا طور پر "بابائے قوم" کے لقب پر فائز کرتا ہے۔ لیکن، جب ہم لاکھوں کسانوں کی بھوک اور قرض کے ہاتھوں خودکشی کی خوفناک حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں، تو یہ نام نہاد جمہوری بھارت اپنی مکمل رسوائی کو کہاں چھپا سکتا ہے؟ اس واضح تضاد کی صرف ایک ہی وضاحت ہے: جمہوریت کے پردے میں، اس قوم کے لوگ مسلسل، قابل نفرت ڈھونگ کا شکار ہیں۔

اصل مسئلے پر بات کرنے سے پہلے، آئیے بدعنوانی کے وسیع مسئلے پر غور کریں۔ عوام ہر قیمت پر اس کے خاتمے کا مطالبہ کرتے ہیں، اسے قومی ترقی میں بنیادی رکاوٹ قرار دیتے ہیں۔ ملک سے غیر قانونی طور پر باہر بھیجے گئے اربوں روپے کی واپسی کے مطالبات کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے: کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قوم کی اکثریت فطری طور پر بے ایمان ہے؟ بصورت دیگر ایک فرضی جمہوریت میں ایسا نظام کیسے برقرار رہ سکتا ہے؟ اتنی بڑی رقم قائم شدہ قانونی راستوں سے گزرے بغیر بیرون ملک منتقل نہیں کی جا سکتی، جس کا مطلب اس لوٹ مار پر اکثریت کی خاموش رضامندی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک رسا ہوا برتن پانی نہیں روک سکتا، پھر بھی ہم بالکل ایسے برتن میں پانی ڈالنے پر بضد ہیں۔ اس ناقص نظام کی مرمت یا تبدیلی سے انکار کرکے، ہم مسلسل، وسیع پیمانے پر ضیاع کی ضمانت دیتے ہیں۔

لیکن جس طرح نمک کو اس کی نمکینیت سے پاک نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اس قوم سے بدعنوانی کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناانصافی اس ریاست کی بنیادی بنیاد ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے، ہمیں ان قواعد و ضوابط کے حقیقی مقصد کا جائزہ لینا چاہیے جنہیں ہم "قوانین" کہتے ہیں۔ صدیوں تک، برطانویوں نے اس سرزمین پر ایک ہی مقصد کے

تحت حکومت کی: اس کے وسائل کی بلا روک ٹوک لوٹ مار۔ جس طرح کوئی خون آسانی سے نکالنے کے لیے جسم کے اعضاء کو باندھ سکتا ہے، اسی طرح ہندوستان کے لوگوں کو متعدد قوانین کے ذریعے باندھا گیا۔ ان قوانین نے انہیں مؤثر طریقے سے برطانوی سلطنت کا غلام بنا دیا۔

اس ظلم کے باوجود، بہت سے لوگوں نے آزادی کا خواب دیکھا، ناقابل بیان تشدد برداشت کیا، بشمول پھانسی کے ذریعے موت۔ نوآبادیاتی حکمرانوں نے پنجاب کے جلیانوالہ باغ میں ہزاروں غیر مسلح، بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کے قتل عام میں کوئی افسوس ظاہر نہیں کیا، یہ قتل عام اندھا دھند فائرنگ سے کیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ خوفناک فعل مکمل طور پر "قائم شدہ قانونی طریقہ کار کے مطابق" کیا گیا تھا۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ "قوانین" برطانوی پارلیمنٹ نے اس سرزمین کے لوگوں کے ذہنوں سے آزادی اور حریت کے کسی بھی تصور کو ختم کرنے کے واضح ارادے سے بنائے تھے۔

بے شمار کتابیں اعلان کرتی ہیں کہ 15 اگست 1947 کو "انڈیا" کہلانے والا علاقہ ایک آزاد قوم کے طور پر ابھرا، ہمارے معزز مجاہدین آزادی کے خوابوں کو پورا کرتے ہوئے۔ تاہم، قریب سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس دن، برطانوی قوانین کی طرح، صرف ایک اور ایکٹ—"انڈین انڈیپینڈنس ایکٹ، 1947"—نافذ ہوا۔ جب سوال کیا جاتا ہے، تو عملی طور پر کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے ذاتی طور پر اس ایکٹ کو دیکھا ہے۔ انہوں نے صرف اخبارات میں پڑھا یا ریڈیو پر سنا کہ اس دن ملک "آزاد" ہو گیا۔ حقیقت میں، اس ایکٹ نے "انڈیا" کو ایک آزاد ملک کے طور پر قائم نہیں کیا۔ سابقہ برطانوی علاقے "انڈیا" کے اندر، ایکٹ نے محض دو "نئی ڈومینینز" بنائیں: "انڈیا" اور "پاکستان"۔ جہاں پہلے ایک کالونی تھی، "انڈیا"، اسے محض دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا—بنیادی طور پر انتظامی سہولت کے لیے دو کالونیاں بنانا، جسے قانونی زبان میں "نئی ڈومینینز" کہا جاتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ایکٹ میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ ہر ڈومینین کے ایگزیکٹو ہیڈ—گورنر جنرل—کو منتخب کرنے کا اختیار متعلقہ ڈومینین کے لوگوں کے پاس نہیں ہوگا۔ اس کے بجائے، برطانوی

بادشاہ گورنر جنرل کا تقرر کرتا تھا، جیسا کہ انڈین انڈیپینڈنس ایکٹ، 1947 کے سیکشن 5 میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہ ایک حیران کن حقیقت ہے کہ جب کہ ایکٹ کا عنوان "انڈین انڈیپینڈنس ایکٹ" ہے، لفظ "انڈیپینڈنس" خود اس کے متن میں کہیں ظاہر نہیں ہوتا۔ ایک سال قبل، 1946 میں، برطانوی حکومت نے ڈومینین کے لیے ایک آئین مسودہ تیار کرنے کے لیے آئین ساز اسمبلی قائم کی۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس آئین ساز اسمبلی کا کوئی بھی رکن "انڈیا کا شہری" نہیں تھا۔ "انڈیا کا شہری" کی اصطلاح پہلی بار "آئین انڈیا" میں ظاہر ہوئی، جو 26 جنوری 1950 کو نافذ ہوا۔ کم از کم اس تاریخ تک، برطانوی علاقے کے تمام باشندے قانونی طور پر برطانوی رعایا تھے۔ لہٰذا، اس آئین میں موجود ہر چیز فطری طور پر برطانوی بادشاہ کی مرضی کے تابع تھی۔ یہی آئین ملک کا سب سے بڑا قانون ہے، اور اگر چاہا بھی جائے تو اسے اس ملک کے آزاد شہری ایک نئے آئین سے تبدیل نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آئین کو تبدیل کرنے کی کسی بھی کوشش کو سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے روک دیا جائے گا جس میں اس کے "بنیادی خدوخال" میں ترمیم پر پابندی ہے۔ اور ہم یہ نہ بھولیں کہ سپریم کورٹ خود اسی آئین کی ایک شق کے تحت بنائی گئی تھی۔

اس کا مطلب ہے کہ سابق نوآبادیاتی آقاؤں نے خود کو چلانے کے لیے بالکل ٹھیک طریقہ کار بھی طے کیے ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر، ہماری آزادی کہاں ہے؟ اسے مزید واضح طور پر بیان کرنے کے لیے، اس تشبیہ پر غور کریں: ایک زمینی فروخت کا تصور کریں جہاں بیچنے والا یہ شرط لگاتا ہے کہ وہ اپنی "فیاضی" سے زمین پر ایک جھونپڑی بنائے گا، اور خریدار، خریداری کے بعد، اس جھونپڑی میں رہنے کا پابند ہے۔ خریدار ضرورت پڑنے پر جھونپڑی کی مرمت کر سکتا ہے، لیکن اسے اسے مسمار کرنے—یعنی اس کے "بنیادی خدوخال" کو تبدیل کرنے—اور مثال کے طور پر، ایک پکا مکان بنانے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ اگر یہ شرط فروخت کی تکمیل کے بعد بھی برقرار رہتی ہے، تو قانون کی نظر میں، فروخت باطل ہے، کیونکہ بیچنے والے کا زمین پر کنٹرول مکمل طور پر ختم نہیں ہوا ہے۔

آئیے تسلیم کرتے ہیں کہ اس ہنگامہ خیز دور میں جب برصغیر ایک زبردست ہلچل سے گزر رہا تھا، ایسی شرط کو قبول کرنا شاید بحران سے نمٹنے کا واحد راستہ لگتا تھا۔ تاہم، اس صورت میں، آئین میں ایک ایسی شق شامل کرنے کی ضرورت تھی جس میں واضح طور پر کہا گیا ہو کہ "آزادی" کے بعد، پارلیمنٹ کے پاس آئین کی توثیق کرنے اور اگر ضروری ہو تو پرانے کی جگہ ایک نیا آئین بنانے کا اختیار ہوگا۔ جیسا کہ واضح طور پر ظاہر ہے، آئین میں ایسی کوئی توثیقی شق موجود نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ "انڈیا" کے نام سے جانے والے برطانوی ڈومینین کے لیے تیار کردہ اور برطانوی بادشاہ کے لیے موزوں ایک آئین لوگوں پر ملک کے سب سے بڑے قانون کے طور پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ یہ ہمارے معزز مجاہدین آزادی کے خوابوں کے بالکل برعکس ہے، جنہوں نے ہندوستان کے لوگوں کو برطانوی حکومت اور استحصال سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ اس آزادی کے لیے بنیادی ضرورت برطانوی ساختہ ان ظالمانہ زنجیروں کو توڑنا تھا جنہیں "قوانین" کہا جاتا تھا، جو برطانوی رعایا کو ہمیشہ کے لیے محکوم رکھنے کے لیے بنائے گئے تھے۔

15 اگست 1947 کے بعد بھی، اور یہاں تک کہ 26 جنوری 1950 کے بعد بھی، برطانوی ساختہ قوانین کی اکثریت اب "انڈیا" کے نام سے جانے والے علاقے میں نافذ العمل رہی۔ "آئین" کے اندر موجود شقوں کے ذریعے، ان برطانوی ساختہ قوانین کو ایک نئی زندگی ملی، ان ہی پابندیوں کو برقرار رکھتے ہوئے جنہوں نے صدیوں سے عوام کو بے حس و حرکت رکھا تھا۔ نتیجے کے طور پر، ملک کی بے رحمی سے لوٹ مار جاری ہے، لوگوں کو ایسے قوانین کے ذریعے ہوشیاری سے پھنسایا جاتا ہے جنہیں وہ بمشکل سمجھتے ہیں۔ موجودہ اندازوں سے پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی وقت بھارتی عدالتوں میں تقریباً تین کروڑ مقدمات زیر التوا ہیں۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ ہر مقدمے سے کم از کم دس افراد براہ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوتے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ ہندوستان میں تقریباً تیس کروڑ لوگ قانونی پریشانیوں سے مسلسل بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان کے حالات بہتر نہیں ہوتے، اس نام نہاد "شمولیتی ترقی" کے بارے میں مسلسل بیان بازی کے باوجود جو ہم سال بہ سال سنتے ہیں۔

یہ حقیقت کہ ہم نے ابھی تک حقیقی آزادی حاصل نہیں کی ہے ہماری روزمرہ زندگی میں واضح ہے۔ 15 اگست 1947 سے پہلے، برطانوی حکومت کے خلاف عدم تشدد اور پرتشدد دونوں احتجاج عام تھے، اور رائل پولیس نے معمول کے مطابق مجاہدین آزادی پر وحشیانہ ظلم و ستم ڈھایا۔ یہ اس وقت قابل فہم تھا، کیونکہ پولیس، تاج کے خادم کے طور پر، خودمختار کے مفادات کے تحفظ کے لیے بے رحمی سے کام کرنے کی پابند تھی۔ تاہم، یہ انتہائی پریشان کن ہے کہ اسی طرح کے پولیس مظالم ہندوستان کے بظاہر سیاسی طور پر آزاد ہونے کے بعد بھی عام ہیں۔ اگر یہ آزادی حقیقی ہے، تو پولیس اب کس کے مفادات کا تحفظ کر رہی ہے؟ اگر جمہوریت نے واقعی لوگوں کو سرزمین کا مالک بنا دیا ہے، تو یہی لوگ احتجاج کیوں کر رہے ہیں؟ اگر، جیسا کہ جمہوریت میں ہے، ہم قانون ساز ہیں، تو ہمیں ان قوانین کو توڑنے پر کیا چیز مجبور کرتی ہے جو ہم نے خود بنائے ہیں؟ اب وقت آگیا ہے کہ ان سوالات کا براہ راست سامنا کیا جائے، اور ہم—اس سرزمین کے لوگ، ہم سب، محض انسان ہونے کے ناطے—ہمیں خود ایسا کرنا چاہیے۔

اس تناظر میں، ہمیں لفظ "ملک" کے حقیقی معنی کا جائزہ لینا چاہیے۔ انسانوں کی آبادی والا علاقہ جسے ہم "ملک" کہتے ہیں۔ انسانوں کے بغیر، کسی ملک کا وجود نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر، اپنی وسیع وسعت کے باوجود، چاند ایک ملک نہیں ہے کیونکہ یہ غیر آباد ہے۔ یہ "انسانوں" اور "ملک" کے درمیان گہرے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ منطقی طور پر، پھر، کسی ملک کی ترقی کو اس کے لوگوں کی ترقی کی عکاسی کرنی چاہیے، کیونکہ کوئی ملک ان لوگوں کو پیچھے چھوڑ کر ترقی نہیں کر سکتا جو اسے تشکیل دیتے ہیں۔ اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس ملک کے زیادہ تر لوگ ترقی کے کسی مصنوعی پیمانے پر "پیچھے رہ گئے" ہیں۔ یہ ایک جان بوجھ کر غلط بیانی ہے۔ اس من گھڑت امتیازی سلوک کو برقرار رکھنے کے لیے، اکثریت کو جان بوجھ کر نقصان کی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ معاشرے کے بالکل آغاز سے ہی، امتیازی سلوک کے بیج احتیاط سے بوئے گئے تاکہ یہ یقینی بنایا جا سکے کہ چند مراعات یافتہ افراد محنت کش عوام کی محنت کا فائدہ اٹھا سکیں۔

اگر وہ لوگ جن کی محنت ناگزیر ہے ایک مربوط اکائی کے طور پر متحد ہو جائیں، تو چند مراعات یافتہ افراد اب معاشرے کی اکثریت پر اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ لہٰذا، آبادی میں امتیازی سلوک کو فروغ دے کر، انہیں بکھرے ہوئے، کمزور افراد میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح، وہ صدیوں سے برداشت کیے جانے والے مصائب پر شاذ و نادر ہی سوال کرنے کی جرات کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ کچھ گہرے، روایتی خیالات میں بنیادی تبدیلی نہیں کی جاتی—اور اس تبدیلی کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت خود لوگوں کے پاس ہے۔ ملک کو بدلنے کے لیے، پہلے خود کو بدلنا ہوگا، جس کے لیے آزادانہ سوچ کی صلاحیت درکار ہے۔ لیکن انسانوں کے بغیر، ملک کا تصور ہی بے معنی ہے۔ لہٰذا، کسی ملک کے اندر کسی بھی انسانی عمل کے لیے، خود لوگ ذمہ دار ہیں۔ چونکہ "ہم" "میں" کی جمع ہے، میں، درحقیقت، ملک ہوں۔ میں نے اسے براہ راست بنایا ہے۔ میرے بغیر، کوئی ملک نہیں ہو سکتا!

کوئی پوچھ سکتا ہے، "کیا اتنا بظاہر چھوٹا خیال واقعی ملک کی موجودہ حالت کو بہتر بنا سکتا ہے؟" اس کا جواب ایک واضح ہاں ہے کیونکہ "میں" میں تبدیلی لامحالہ ملک میں تبدیلی کی علامت ہے۔ تب بھی، کوئی اعتراض کر سکتا ہے، "اگر یہ خیال اتنا طاقتور ہے، تو لوگوں کی بدحالی کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ اس کے علاوہ، ملک نے نمایاں ترقی کی ہے، یہاں تک کہ خلائی ٹیکنالوجی میں بھی قابل ذکر پیش رفت کی ہے۔ آپ کے منطق کے مطابق، اس کا مطلب لوگوں کے معیار زندگی میں خاطر خواہ بہتری ہونی چاہیے۔" جواب میں، ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اس ترقی کے فوائد سے آبادی کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہی لطف اندوز ہوتا ہے، جبکہ اکثریت اس سے محروم ہے۔ اکثریت میں اب بھی فاقہ کشی، غذائی قلت اور خودکشیاں عام ہیں۔ اس تفاوت کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ "میں ملک ہوں" کا خیال ابھی تک معاشرے میں نہیں پھیلا ہے۔

یہ بالکل یہی شعور کی کمی ہے جو ملک کی قابل افسوس حالت کو تبدیل ہونے سے روکتی ہے۔ اگر لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں، تو یہ بلاشبہ ایک ایسے سماجی نظام میں نمایاں ہلچل پیدا کر دے گا جو بے رحمانہ استحصال پر مبنی ہے۔ اس طرح کے منظر نامے کو روکنے کے لیے،

استحصال کرنے والوں کی ایک قلیل تعداد جان بوجھ کر اس خیال کو خیالی قرار دیتی ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ اگر لوگوں نے معاشرے میں اپنی حقیقی حیثیت کو پہچان لیا تو ان کی پوری بدعنوان عمارت تاش کے پتوں کی طرح گر جائے گی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ خیال نہ صرف خیالی نہیں ہے بلکہ اس نام نہاد مہذب نظام کو ختم کرنے کا ایک انتہائی آسان طریقہ بھی ہے۔ اس واضح راستے کو چھپانے کے لیے، شروع سے ہی کوششیں کی گئی ہیں کہ زیادہ تر لوگوں کو ناخواندگی اور غربت کے اندھیرے میں رکھا جائے۔ اب وقت آگیا ہے کہ باہر نکلنے کا راستہ تلاش کیا جائے، اور ہم سب کو اس مقصد کی طرف کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ ہم اس ملک کا مجسمہ ہیں!

اس ملک کے حالات کو بغیر کسی پیچیدہ نظریے کے سمجھنے کے لیے، آئیے ایک بڑے گھر کی مثال استعمال کرتے ہیں جہاں ایک پرجوش جشن ہو رہا ہے۔ رات کا وقت ہے، گھر روشن ہے، اور مہمان لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اچانک، بدنیتی سے، کوئی مین پاور سپلائی منقطع کر دیتا ہے۔ پورا گھر اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے، اور فوری طور پر افراتفری پھیل جاتی ہے۔ لوگ خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اندھیرا انہیں روکتا ہے، جس سے الجھن اور گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں، فرنیچر الٹ جاتا ہے، اور عام بدنظمی پھیل جاتی ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس بظاہر لامتناہی افراتفری سے کیسے نکلیں؟

بجلی سے ناواقف لوگوں کے لیے، اس افراتفری کو حل کرنا ناقابل یقین حد تک مشکل لگ سکتا ہے۔ کچھ لوگ اس صورتحال کو منفی انسانی خصلتوں جیسے کہ کمینگی اور خود غرضی سے بھی منسوب کر سکتے ہیں۔ تاہم، حل بہت آسان ہے: کسی کو صرف مین پاور سوئچ کو واپس "آن" کرنا ہے۔ روشنی کی محض واپسی اندھیرے کی وجہ سے پیدا ہونے والی افراتفری کو فوری طور پر ختم کر دے گی۔ اسی طرح، اس وسیع سرزمین کے تمام مسائل کی بنیادی وجہ ہمارے ذہنوں کے اندر جہالت کے اندھیرے میں پوشیدہ ہے۔ جب تک اس جہالت کا خاتمہ نہیں ہوتا، یہ مسائل غیر معینہ مدت تک برقرار رہیں گے، اور ہم اندھیرے میں ایک دوسرے کو دوست کے طور پر پہچاننے سے قاصر، دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑتے

رہیں گے۔ لیکن ہمیں سمجھنا چاہیے: کسی نے جان بوجھ کر روشنی بند نہیں کی۔ انسانی تہذیب کی تاریخ میں، مکمل آگاہی کی روشنی کبھی صحیح معنوں میں آن نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر لوگ آزادانہ سوچ سے محروم رہے ہیں۔ تاہم، ہم اپنی حقیقی اندرونی طاقت سے آگاہ ہونے کے اس بظاہر ناممکن کام کے لیے خود کو وقف کرنے کے لیے پرعزم ہیں۔ اور اس کا وقت اب ہے۔

شروع کرنے کے لیے، آئیے اس ملک کے نام پر غور کریں۔ قدیم زمانے سے، اسے "بھارت ورش" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سندھو ندی کے کنارے ایک تہذیب پروان چڑھی، جسے غیر ملکی زبانوں میں وادی سندھ کی تہذیب کے نام سے جانا گیا۔ تاہم، اس تہذیب کے عروج سے پہلے بھی، اس سرزمین کے جنوبی حصے میں ایک انتہائی ترقی یافتہ تہذیب موجود تھی، جیسا کہ رزمیہ رامائن میں موجود تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے۔ پھر بھی، غیر ملکی حملہ آوروں نے، اپنے مقاصد کے لیے، پوری سرزمین کو گھیرنے کے لیے "وادی سندھ کی تہذیب" کی اصطلاح وضع کی اور ملک کا نام "انڈیا" رکھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ "آزادی" کے بعد بھی، اس عظیم قدیم سرزمین کو سرکاری طور پر اب بھی "انڈیا" کہا جاتا ہے۔ جب کہ افراد کے کبھی کبھار ایک سے زیادہ نام ہو سکتے ہیں، ایک ہی سرزمین کے دو سرکاری نام کیسے ہو سکتے ہیں: "انڈیا" اور "بھارت"؟

ہماری گہری جڑی ہوئی محکومیت کی ایک واضح مثال خود آئین میں ملتی ہے، جہاں ملک کا نام "انڈیا، یعنی بھارت" ہے۔ یہ بتانے والی بات ہے کہ جملہ "بھارت، یعنی انڈیا" نہیں ہے۔ نام "انڈیا" کو ترجیح دی گئی ہے، غالباً ہمارے سابق برطانوی حکمرانوں کی سہولت کے لیے۔ چونکہ ہم خود کو واقعی آزاد قرار دیتے ہیں، اس لیے ہمیں "انڈیا" کو مسترد کرتے ہوئے، "بھارت" کو اپنے ملک کے واحد نام کے طور پر اپنانا چاہیے۔ بہت سے لوگوں نے "مہابھارت" کا مطالعہ کیا ہے، لیکن کسی نے کبھی "مہا انڈیا" نام کی کسی چیز کے بارے میں نہیں سنا۔ آئیے "انڈیا" کی اصطلاح کو اپنے بھارت سے نکال دیں، کیونکہ یہ ہماری ماضی کی غلامی کے نشان کے سوا کچھ نہیں ہے۔

کیونکہ حقیقی آگاہی کی شمع کبھی نہیں جلائی گئی، لوگوں نے کبھی صحیح معنوں میں آزادی کا تجربہ نہیں کیا۔ منظم معاشرے کے بالکل آغاز سے ہی، کنٹرول کرنے والی طاقت "بادشاہ" کے ہاتھوں میں سونپی گئی ہے۔ اس کے احکامات قانون بن گئے؛ اس کا لفظ حتمی تھا۔ لیکن ہم یہ پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں کہ بادشاہ کی بادشاہت، تمام قوانین کا مبینہ منبع، خود بنیادی طور پر ناجائز ہے۔ آئیے اسے دوبارہ دہراتے ہیں: ہم اس معاملے پر پیچیدہ یا خوبصورت نظریات کا سہارا لیے بغیر براہ راست بات کریں گے۔

اس کی وضاحت کے لیے، آئیے ماقبل تاریخ کے زمانے کے ایک دن کا تصور کریں، یہاں تک کہ انسانی معاشرے کی تشکیل سے بھی پہلے۔ ایک چھوٹی سی ندی بہتی ہے، اور اس کے کنارے ایک آم کا درخت کھڑا ہے۔ ایک آدمی درخت پر چڑھ رہا ہے، آم توڑ رہا ہے۔ تھوڑی دور، ایک اور آدمی مچھلی پکڑ رہا ہے۔ پھر ایک تیسرا آدمی ظاہر ہوتا ہے۔ انہیں ایک لمحے کے لیے دیکھنے کے بعد، وہ درخت میں موجود آدمی کے پاس جاتا ہے اور پوچھتا ہے، "آپ کیا توڑ رہے ہیں، میرے دوست؟" آدمی جواب دیتا ہے، "پھل۔ کیا آپ ایک آزمانا چاہیں گے؟" اجنبی ایک پکا ہوا آم لیتا ہے، اسے لذیذ پاتا ہے، "آم والے آدمی" کا شکریہ ادا کرتا ہے، اور پھر مچھیرے کے پاس جاتا ہے۔ اسی طرح کے تبادلے کے بعد، اسے تحفے کے طور پر ایک مچھلی ملتی ہے اور وہ "مچھلی والے آدمی" کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

اگلے دن، اجنبی واپس آتا ہے، اس بار ایک دوست کے ساتھ وہ پہلے آم توڑنے والے کے پاس جاتے ہیں۔ یہ جان کر کہ نیا آنے والا بھی آم آزمانا چاہتا ہے، درخت میں موجود آدمی ایسا کرنے پر فخر محسوس کرتے ہوئے اور بھی زیادہ جوش و خروش سے اپنا پھل بانٹتا ہے۔ پھر وہ مچھلی والے کے ساتھ بھی یہی عمل دہراتے ہیں۔ غور کریں کہ بغیر کسی محنت کے آم اور مچھلی کھا کر، اجنبی محنت کشوں سے تقریباً دوگنی توانائی حاصل کرتے ہیں۔ محنت کش درخت پر چڑھنے یا مچھلی پکڑنے میں اپنی تقریباً آدھی توانائی خرچ کرتے ہیں، جبکہ اجنبی کوئی توانائی خرچ نہیں کرتے۔ اس طرح، دھوکہ دہی کے ذریعے، تیسرا شخص دوسروں کی محنت کا پھل کھا کر آہستہ آہستہ زیادہ طاقتور بن جاتا ہے۔ جیسے جیسے اس کی طاقت اور اثر و رسوخ بڑھتا ہے، لوگ اس سے ڈرنے لگتے ہیں۔ جو چیز کبھی

احسان کے طور پر آزادانہ طور پر دی جاتی تھی وہ وقت کے ساتھ ساتھ لازمی "تحفظ کا پیسہ" بن جاتی ہے، بالآخر اسے قانون ساز اور بادشاہ کے طور پر قائم کرتی ہے۔ یہ "قانون کی حکمرانی" کے پردے میں بادشاہ کے لوگوں کے استحصال کے آغاز کی علامت ہے۔

اس چالاک شخص نے دھوکہ دہی کے ذریعے اپنی "بادشاہت" شروع کی——دوسرے لفظوں میں، غیر قانونی طور پر۔ جو چیز خیر سگالی سے دی گئی خیرات کے طور پر شروع ہوئی تھی وہ جبری طور پر محصول یا ٹیکس کی وصولی میں تبدیل ہو گئی۔ آبادی سے ان ٹیکسوں کی ہموار وصولی کو یقینی بنانے کے لیے وقت کے ساتھ ساتھ مختلف پالیسیاں نافذ کی گئی ہیں۔ ایسا ہی ایک نظام، جسے اب تقریباً مذہبی حیثیت حاصل ہے، معاشیات کہلاتا ہے۔ چونکہ "طاقت ہی حق ہے" کا اصول غالب ہے، بادشاہ کوئی غلط کام نہیں کر سکتا اور اسے ہمیشہ بلا چون و چرا درست سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ خودمختار کا حکم قانون ہے، قانون کی پابندی کرنے والی رعایا بادشاہ کی اطاعت کرنے کی پابند ہے۔

لوگوں نے بادشاہ کی خودمختاری کو رضاکارانہ طور پر قبول نہیں کیا؛ انہیں جبری طاقت کے ذریعے اطاعت پر مجبور کیا گیا۔ تاہم، بادشاہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اس کا وجود مکمل طور پر فرمانبردار رعایا کی موجودگی پر منحصر ہے۔ یہ حقیقت کہ یہ رعایا یہ سمجھنے میں ناکام رہتی ہے کہ وہ تمام طاقت کا حقیقی منبع ہیں، کہ وہ سب برابر ہیں اور ایک ہی انسانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، نے اس استحصالی نظام کے بالکل آغاز سے ہی ان میں تقسیم پیدا کر دی ہے۔ امیر اور غریب، تعلیم یافتہ اور ناخواندہ، اونچے اور نیچے کے امتیازات سے ہٹ کر، بے شمار دیگر مصنوعی زمرے احتیاط سے تیار کیے گئے، مختلف مذاہب، ذاتیں وغیرہ ایجاد کی گئیں۔ اس طرح، لوگوں کو بے شمار گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ایسی تقسیم جو کبھی موجود نہیں تھی اور فطرت میں کبھی موجود نہیں ہو سکتی۔ سادہ لوح رعایا، بے معنی خانہ جنگی میں مصروف، بادشاہ کی اس چالاک چال کو پہچاننے میں ناکام رہی۔ اس طرح بادشاہت کے خیموں نے انسانی معاشرے کو مکمل طور پر کھا لیا۔ اس کے پیش نظر، یہ پہچاننا ضروری ہے کہ اصطلاح "غریب" ایک غلط نام ہے۔ روایتی طور پر، ایک

شخص کو "غریب" کہا جاتا ہے اگر وہ روزانہ بنیادی بقا کے لیے جدوجہد کرتا ہے—مثال کے طور پر، ایک کوئلہ کان کن۔ ہر روز اپنی جان خطرے میں ڈال کر، وہ کوئلہ نکالنے کے لیے کان میں اترتا ہے۔ کوئلے کے بغیر، کیا کوئلے سے چلنے والے پاور پلانٹس ہو سکتے ہیں؟ کیا وہ بڑے پیمانے پر صنعتیں جو کوئلے پر انحصار کرتی ہیں وہ بھی موجود ہو سکتی ہیں؟ بالآخر، اس بے پناہ دولت کا حقیقی منبع وہی "غریب" مزدور ہے۔ پھر ہم ایسی بے پناہ دولت کے خالق کو "غریب" کہنے کی جرات کیسے کر سکتے ہیں؟

آئیے اب لفظ "ناخواندہ" پر غور کریں۔ ہم، نام نہاد "تعلیم یافتہ" لوگ، ایک کسان یا ایک موچی کو ناخواندہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ ہمیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ ہم، جو اپنی تعلیم پر فخر کرتے ہیں، وہ کام نہیں کر سکتے جو ایک کسان یا موچی آسانی سے کرتا ہے۔ کیا ہم پھر ان کی مہارتوں میں بھی ناخواندہ نہیں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اکثر رسمی تعلیم کی کمی ہوتی ہے کیونکہ انہیں ایسے مواقع سے محروم رکھا گیا ہے۔ یہ کسی کی ٹانگ جان بوجھ کر توڑنے اور پھر اس کی "بدقسمتی" پر ترس کھانے کے مترادف ہے۔

بادشاہت کے بعد نام نہاد جمہوریت آئی۔ بادشاہ کی طاقت سے حسد کی وجہ سے، کچھ افراد نے اقتدار پر قبضہ کرنے کی سازش کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حقیقی طاقت لوگوں کے پاس ہے، اس لیے انہوں نے "جمہوریت" میں لفظ "ڈیموس" (لوگ) استعمال کیا، بظاہر یہ خیال ظاہر کرتے ہوئے کہ لوگ براہ راست ملک کے معاملات چلاتے ہیں۔ تاہم، حقیقت یہ ہے کہ "جمہوریت" بادشاہت کی ایک اور شکل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بادشاہت کی طرح ایک بادشاہ کے بجائے، "جمہوریت" میں متعدد "وزیر" ہوتے ہیں۔

جس طرح بادشاہ کے اختیار کو نافذ کرنے کے لیے غلامی کی زنجیروں کو برقرار رکھنا پڑتا تھا، اسی طرح نام نہاد جمہوریتوں میں بھی، بادشاہت کے دور کے تمام قوانین کو لوگوں کی بلا روک ٹوک لوٹ مار کو یقینی بنانے کے لیے برقرار رکھا گیا ہے۔ نتیجے کے طور پر، دولت فراہم کرنے والے کے طور پر لوگوں کا کردار ویسا ہی برقرار ہے جیسا کہ بادشاہت میں تھا۔

لہٰذا، یہ وسیع پیمانے پر مشہور خیال کہ جمہوریت میں "ہم سب بادشاہ ہیں" محض شاعرانہ تخیل ہے، جس کی حقیقت میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔ "جمہوریت" میں کہا جاتا ہے کہ لوگوں کے نمائندے ملک کے معاملات کی "ہدایت" کریں گے، لیکن عملی طور پر، سیاسی جماعتوں کے منتخب کردہ کچھ افراد ملک پر "حکومت" کر رہے ہیں۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ ہم اب بھی "حکمران جماعت" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ کوئی یہ سوال نہیں کرتا کہ "آزادی" حاصل ہونے کے بعد "حکمران" کیسے موجود ہو سکتے ہیں، یا یہاں تک کہ "جمہوریت" میں لفظ "حکومت" کی مطابقت پر بھی کوئی سوال نہیں کرتا۔

اس ملک میں انتخابات نمائندگی ایکٹ، 1951 کے مطابق ہوتے ہیں، لیکن جو لوگ ان انتخابات میں "مقابلہ" کرتے ہیں وہ لوگوں کے حقیقی نمائندے نہیں ہیں۔ تقریباً ہر معاملے میں، وہ کسی نہ کسی سیاسی جماعت کے زیر کنٹرول ہوتے ہیں۔ لہٰذا، ان کی بنیادی ذمہ داری لوگوں کے ساتھ نہیں، بلکہ اپنی جماعت کے ساتھ ہے۔ یہ فرض کرنا معقول ہوگا کہ تمام انتخابی امیدوار ملک کے شہریوں کی فلاح و بہبود کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ توقع کرنا بھی معقول ہوگا کہ سیاسی جماعتوں کے پاس اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے واضح، اچھی طرح سے متعین منصوبے ہیں۔ اگر یہ سچ ہوتا تو انتخابات "جیتنے" کے لیے اتنی شدید مسابقت کیوں ہے؟ ایک سادہ سی مثال پر غور کریں: اگر کئی لوگ کسی گھر کو رنگنے کے لیے بہترین رنگ پر بحث کر رہے ہوں، تو کوئی سفید، کوئی گلابی اور کوئی سرمئی تجویز کر سکتا ہے۔ پھر بھی، ان سب کا مشترکہ مقصد گھر کو خوبصورت بنانا ہوگا۔ اگر وہ دشمن نہیں ہیں تو سیاست میں یہ تعاون کی روح کیوں موجود نہیں ہے؟ اس لیے نہیں کہ باہمی دشمنی کو برقرار رکھنا استحصالی موجودہ صورتحال کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ لہٰذا، یہ واضح ہے کہ ریاستی نظام میں بنیادی تبدیلی کے بغیر، حقیقی ترقی اور لوگوں کے حالات میں بہتری ناممکن ہے۔ اس تبدیلی کو حاصل کرنے کے لیے، ہمیں پہلے اپنی کمزوریوں کے ذرائع کو ختم کرنا ہوگا۔

ہم اکثر سوچتے ہیں کہ ایک فرد پورے نظام کی جمود کو کیسے بدل سکتا ہے۔ سب سے پہلے، ہم یہ پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں کہ ملک کی موجودہ

حالت ہماری اجتماعی بے عملی کا براہ راست نتیجہ ہے۔ یہ جمود لامحالہ اس وقت ختم ہو جائے گا جب ہم عمل کرنا شروع کر دیں گے۔ دوم، میں اکیلا نہیں ہوں۔ ایک ارب تیس کروڑ سے زیادہ "میں" مل کر موجودہ "انڈیا" بناتے ہیں۔ ہر "میں" دوسرے سے گہرا تعلق رکھتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے بے شمار خلیے جو انسانی جسم بناتے ہیں۔ جب جسم زخمی ہوتا ہے تو پورا جسم ایک ساتھ رد عمل ظاہر کرتا ہے اور کھربوں خلیے مل کر جارحیت کے خلاف دفاع کرتے ہیں۔ یہ دوسرے خلیوں سے منسلک ہونے پر ایک خلیے کی بے پناہ توانائی کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح، ہم میں سے ہر ایک بے پناہ طاقت کا ایک وسیع ذخیرہ ہے، جس سے ہم بڑی حد تک بے خبر ہیں۔

جب اس سرزمین کے تمام لوگ یہ جان لیں گے کہ ہم سب ایک ہی خاندان کے رکن ہیں اور ہم ایک دوسرے کے تکمیلی ہیں، تو ہمارا اجتماعی شعور بیدار ہو جائے گا۔ جس طرح ایک مثالی خاندان میں بدعنوانی کی کوئی جگہ نہیں ہوتی، اسی طرح ملک میں بھی بدعنوانی کے موجود ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔ جس طرح کسی خاندان کے تمام افراد کسی مسئلے کو بانٹتے ہیں، اسی طرح ہم بھی ملک کے کسی بھی حصے میں پیدا ہونے والے ہر مسئلے کو بانٹیں گے۔ کوئی بھی کہیں بھوکا نہیں رہے گا۔ یہ بیک وقت لوگوں کے ذہنوں سے نفرت، حسد یا جلن کے تمام اسباب کو ختم کر دے گا۔

مزید یہ کہ، چونکہ دنیا میں انسانیت کی جگہ کو سب سے اہم سمجھا جاتا ہے، اس لیے پیسے کو ایک ماتحت مقام پر ہونا چاہیے۔ تاہم، حقیقت میں اس کے برعکس ہے، اس لیے ہمیں پیسے کے کردار کا شعوری طور پر دوبارہ جائزہ لینا چاہیے۔ انسانیت سے بالاتر کوئی چیز نہیں ہونی چاہیے، یہاں تک کہ پیسہ بھی نہیں۔ چونکہ "جمہوریت" ایک غلط نام ہے، آئیے اس مثالی نظام کو ایک نیا نام دیں۔ چونکہ لوگوں کا وجود ایک ملک بناتا ہے، اس لیے ہم نے بنگالی میں "گناستا" کی اصطلاح وضع کی ہے تاکہ یہ ظاہر کیا جا سکے کہ ایسی ریاست میں، لوگ ملک کے انتظام کے ہر پہلو میں سب سے اہم کردار ادا کریں گے۔

ایک نام نہاد "جمہوریت" میں، لوگوں کا کردار "ووٹروں" یا "انتخاب کنندگان" تک محدود کر دیا جاتا ہے، جبکہ ان پر حکومت کرنے کی اصل طاقت "منتخب" نمائندوں کے پاس ہوتی ہے۔ ایک بار جب یہ نمائندے "منتخب" ہو جاتے ہیں—کسی بھی ذریعے سے، جائز یا ناجائز—وہ نظام پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں، اور لوگ اپنی بدقسمتی کے محض خاموش تماشائی بن جاتے ہیں۔

گناستا کے تحت، یہ صورتحال یکسر تبدیل ہو جائے گی۔ لوگ انتخابات کے بعد بھی اپنی حقیقی طاقت کا استعمال کریں گے۔ مناسب حکام کے ذریعے انتخابی قانون میں ایک مناسب ترمیم نافذ کی جائے گی، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ ایک منتخب نمائندہ صرف ووٹروں کی خوشنودی پر ہی عہدہ رکھے۔ اس کا مطلب ہے کہ لوگوں کے پاس جب بھی ضروری لگے کسی منتخب نمائندے کو واپس بلانے کا اختیار ہوگا، جو بدعنوانی کو اس کی جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ اس طرح کی واپسی کا امکان بھی عہدے پر موجود لوگوں کو ایک واضح پیغام بھیج کر صورتحال کو نمایاں طور پر بہتر بنائے گا۔

ایک بار جب گناستا مضبوطی سے قائم ہو جائے گا، ہم میں سے ہر ایک آہستہ آہستہ یہ جان لے گا کہ ہمارا وجود مکمل طور پر دوسروں کی فلاح و بہبود پر منحصر ہے۔ ہم کسی سے نہ اوپر ہیں نہ نیچے؛ ہر کوئی یکساں طور پر اہم ہے۔ نتیجے کے طور پر، ہمارے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہوگی، بالکل اسی طرح جیسے انسانی جسم میں کھربوں خلیوں کے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہوتی۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ پاؤں، دماغ اور جسم کا ہر دوسرا حصہ ایک ہی خلیوں سے بنا ہے، جو انہیں یکساں طور پر اہم بناتا ہے۔ پھر بھی، یہ قدرتی ہم آہنگی انسانی معاشرے میں موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ سادہ ہے: قدیم زمانے سے، لوگوں کو متحد ہونے سے روکنے کے لیے، "بادشاہوں" نے سطحی لیبلز اور درجہ بندیوں کے ذریعے مصنوعی طور پر تقسیم پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی انسان "اتحاد میں تنوع" کے گمراہ کن، رنگ برنگے نعرے کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ جب یہ حقیقی انسان بیدار ہوگا اور کنٹرول سنبھالے گا، تو گناستا قائم ہوگا، اور گناستا میں دنیا کا مستقبل ہے۔

ایسے سماجی نظام کو قائم کرنے کے لیے، "میں ہی بھارت" کے نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل دی گئی ہے۔ کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ اس سرزمین کے تمام لوگ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے کوئی حقیقی رکاوٹ نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہم سب ملک کی مجموعی ترقی کے خواہاں ہیں۔ براہ کرم ہمارے ساتھ شامل ہوں، اور آئیے مل کر آگے بڑھیں۔ اس ملک کا مستقبل—جو ہمارا مستقبل بھی ہے—بالکل ویسا ہی ہوگا جیسا ہم اس کا تصور کرتے ہیں، کیونکہ ہمارے بغیر—میرے بغیر—بھارت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ میں ہی بھارت!

میں ہی بھارت کے آئین سے ایک اقتباس

دفعہ ۲۔ مقاصد و اہداف

پارٹی کا مرکزی مقصد اور نصب العین یہ ہوگا کہ بھارت کی پوری آبادی کو ایک بڑے خاندان میں ضم کیا جائے۔ مذکورہ خاندان کے تمام افراد کو صرف انفرادی فطری انسانوں کے طور پر تسلیم کیا جائے گا جو ہر لحاظ سے برابر ہوں، ان پر مذہب، نسل، ذات، جنس، سماجی حیثیت وغیرہ سے متعلق بیرونی اور مصنوعی امتیازات کو نظر انداز کرتے ہوئے جو انہیں ہمیشہ آپس میں تقسیم رکھتے ہیں۔

پارٹی پختہ یقین رکھتی ہے کہ بھارت میں رہنے والے انسانوں کے مصائب کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کی بے پناہ اکثریت کو ہمیشہ فیصلہ سازی کے مرکزی عمل سے دور رکھا جاتا ہے، جبکہ صرف مٹھی بھر لوگ باقی آبادی کو ذہین انسانوں کے بجائے محض اعداد و شمار سمجھتے ہوئے اپنی مرضی کے مطابق ملک کے معاملات چلاتے ہیں۔ چونکہ کئی دہائیاں کسی مادی تبدیلی کے بغیر گزر چکی ہیں، اس لیے اب وقت آگیا ہے کہ لوگ خود

براہ راست صورتحال کا کنٹرول سنبھالیں تاکہ بھارت ہر شعبے میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر سکے۔

صرف انسانی باشندوں کی موجودگی سے ہی ایک علاقہ ایک ملک میں تبدیل ہوتا ہے، اس طرح اس ملک کا ہر انفرادی باشندہ درحقیقت بھارت کا مترادف ہے۔ اس احساس کے ساتھ کہ وہ خود بھارت ہے، ہر فرد میں قوم کی تعمیر کے مقدس کام میں خوش اسلوبی سے آگے آنے کا بے پناہ اعتماد پیدا کر سکتا ہے۔ اسی لیے پارٹی کا نام "میں ہی بھارت" ہے۔

اس مرکزی خیال کی رہنمائی میں، پارٹی درج ذیل طریقہ کار اختیار کرے گی:

ایک آزاد انفرادی انسان کی خودمختاری کا انتہائی احترام کرتے ہوئے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ ان میں سے ہر ایک کا ایک مشترکہ ورثہ ہے اور وہ اس سرزمین کے مالکوں میں سے ایک ہے جس کے واضح حکم کے بغیر اس ملک میں کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہ کہ غربت، ناخواندگی، سماجی امتیازات وغیرہ، جو افراد کے درمیان دشمنی پیدا کرنے والے اجزاء ہیں، انہیں استحصال کے لیے ہمیشہ کے لیے محکوم رکھنے کے لیے جان بوجھ کر پیدا کیے جاتے ہیں۔

یہ کہ جس فرد کو غریب کہا جاتا ہے وہ غریب نہیں ہے، اس کے برعکس، وہ دولت کا واحد ذریعہ ہے۔

یہ کہ نوآبادیاتی دور میں نام نہاد "قوانین" کے نام پر رعایا کو غلام بنانے کے طریقے اب بھی اپنی پوری طاقت کے ساتھ اپنے تمام خون چوسنے والے خیموں کے ساتھ کام کر رہے ہیں، حالانکہ لوگوں کو آزاد کہا جاتا ہے۔ اور

مزید یہ سمجھتے ہوئے کہ کوئی بھی موجودہ نظام لوگوں کی مشترکہ خواہشات کے تابع ہونا چاہیے اور تسلط کے ذریعہ کے طور پر کام نہیں کر سکتا، میں ہی بھارت ہر باشندے سے درخواست کرتے ہوئے موجودہ

سماجی، معاشی، سیاسی اور قانونی نظاموں کو بنیادی طور پر تبدیل کرنے میں ہر لحاظ سے پرجوش طریقے سے معاون ثابت ہوگا کہ وہ خوش اسلوبی سے آگے آئیں اور طاقت کے ساتھ ساتھ اعتماد کی پوزیشن سے ملک کے معاملات کا خیال رکھیں۔